ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟

رحمۃ اللہ علیہ
مولانا عبد العلیم اصلاحی

مکتبۃ الاقصی





ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟



(۱۹۹۹ء)



مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

سیاست کی ضرورت



سیاست کتنی ضروری چیز ہے اوراس کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھئے کہ جو گروہ بھی سیاست سے کنارہ کش رہے گا وہ بیل اور گھوڑے کے مانند ہوگا۔بیل اور گھوڑے کا کام اپنے مالک کی گاڑی کھینچنا ہوتا ہے اور مالک صبح وشام جو چارہ دے وہ خاموشی سے کھائے۔اسی طرح سیاست سے کنارہ کش رہنے والے لوگ غالب حکمرانوں کی مرضی کے تابع بن کر رہیں گے۔ان کی مرضی اور پسند کا ملکی اور قومی امور میں کوئی دخل نہ ہوگا حتی کہ انہیں اپنے ذاتی معاملات میں بھی بڑی حد تک حکمران طبقہ کی مرضی کا خیال کرنا ہوگا اس لئے کوئی ایسا گروہ جو زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنا مخصوص عقیدہ اور نظریہ رکھتا ہو اور اس عقیدہ کے تحت پوری زندگی کا مکمل نقشہ اور نظام رکھتا ہو وہ سیاست سے کیونکر کنارہ کش رہ سکتا ہے اور اگر سیاست سے بے تعلق ہو یا ایسی سیاست کے نہر میں غوطہ لگا رہا ہو جو اس کے اپنے عقیدہ اور نظریہ کے مخالف چشمے سے نکلی ہو تو ان دونوں صورتوں میں وہ گویا اپنے عقیدے اور نظریہ کے درخت پر خود کلہاڑی چلا رہا ہے اور اپنی عزت اور خودداری سے ہمیشہ کے لئے دامن جھاڑ چکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

ہندوستان میں مسلم قوم کا یہی حال ہے۔تقسیم ہند کے بعد جب انہوں نے ایک بزرگ کے زیر صدارت یہ فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کی علیحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانی نہ صحیح ہے نہ مفید تو اسی وقت گویا یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مسلمان اس ملک میں ہمیشہ کے لئے غیروں کے تابع بن کر رہیں گے اور وہ بحیثیت ایک گروہ یا ایک قوم اور ملت کبھی بھی عزت کے مقام پر نہیں بیٹھیں گے۔ان کا عقیدہ توحید شرک اور الحاد کے ماتحت رہے گا ان کی تہذیب دیو مالائی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب ہوگی۔ان کی زبان کسمپرسی کی حالت میں ہوگی اور ان کا اپنا تشخص مشرکانہ طور طریقہ کی زد میں ہوگا۔چنانچہ ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ان کا عقیدہ، ان کا دین حتی کہ ان کا پرسنل لاء، ان کی کتاب، ان کی تہذیب اور زبان ان کی عبادتگاہیں غیروں کے ہمہ جہتی حملوں کی زد

میں ہیں اور ان کا کام مدافعانہ طور پر التجا، گزارش اور مطالبہ کرنے کے سواء کچھ نہیں رہا۔ یہ جو کچھ ہوا وہ بالکل فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر ہوا کیونکہ جب انہوں نے اپنے دماغ سے ملی حیثیت میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کی سوچ ہی نکال دی اور یہ سمجھ لیا کہ اب اس ملک میں ہم اقتدار کے منصب پر فائز ہی نہیں ہو سکتے تو کیا ہوگا۔ انسان جب کوئی بات سوچ تک نہیں سکتا تو اس کے کرنے کا کیا سوال؟

جب کوئی فوج شکست خوردہ ہو جائے، اس کے حوصلے پست ہو جائیں تو وہ کیا میدان میں اترے گی اور کیا میدان مارے گی۔ اس کی مکمل تصویر اگر دیکھنی ہو تو ہماری پچھلی پچاس سالہ تاریخ کو کوئی دیکھ لے۔ ہم میدان سیاست میں اگر اترے تو دوسروں کے دست نگر اور محتاج بن کر، غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے سائل اور ایسے بھکاریوں کے روپ میں آئے جن کو ہر در سے نامراد واپس کیا گیا۔

ایک دوسرے رخ سے غور کیجئے

اسلام ہمارے عقیدہ کے مطابق ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ہدایات اور بنیادی اصول اس کے اندر موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی طبقہ سیاست میں پڑنے کو دینداری کے خلاف سمجھتا ہے۔ دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اصول کو مانتے ہیں کہ سیاست میں دین اور مذہب کو دخل نہیں دینا چاہئے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے زندگی کو کئی خانوں میں اس طور پر تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ یہ مذہبی حصہ ہے اور یہ سیاسی؛ بلکہ زندگی کو مکمل طریقہ سے مذہبی اور دینی ہونا چاہئے کسی بھی شعبہ کو الگ کرنا ایک غیر دینی عمل ہوگا۔ جس چیز سے مسلمان کی آخرت بننے والی ہے اسی سے دنیا بھی بنے گی۔ دنیا و آخرت دونوں جہاں کی کامیابی کی منزل تک پہنچنا ایک ہی راستہ سے ممکن ہے۔ دنیا کے لئے الگ راستہ اور آخرت کے لئے الگ راستہ اپنانا دینی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ اس اصول کے تحت نقشہ کار بناتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی دنیا بھی بگڑے گی اور آخرت کے بگڑنے کا بھی سخت اندیشہ ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے "الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ"۔

اس روشنی میں جب آپ سیاست کے موضوع پر سوچیں گے تو خود بخود یہ بات لازم ہو جائے گی کہ ہمارا سیاسی فارمولہ لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ جو اسلامی اصولوں کے تحت ہو اور جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اخروی کامیابی بھی حاصل کر سکیں اور دنیا میں بھی بامراد ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر سیاسی حکمت عملی اختیار کریں گے تو آخرت میں خسارہ سے دوچار ہوں گے اور دنیا بھی بگڑے گی۔ اس لحاظ سے بحیثیت مسلمان ہم مجبور

ہیں کہ ہم جو بھی سیاسی نقشہ کار بنائیں اس کا ماخذ کتاب وسنت میں موجود ہو۔اس مقام پر ملت اسلامیہ کی تیسری بدقسمتی یہ سامنے آتی ہے کہ مسلمان دانشور حتی کہ علماء بھی جب سیاسی موضوع پر سوچتے ہیں یا گفتگو کرتے ہیں تو دینی سرچشموں سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے کفار ومشرکین، مذہب بیزار اور مادہ پرست لیڈروں اور سیاست دانوں کے افکار ونظریات کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔کتاب الٰہی اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں دنیا کے سامنے کوئی نقشہ کار پیش کرنا تو دور کی بات ہے خود اپنے لئے بھی زمانے سے ہٹ کر کوئی لائحہ عمل متعین نہیں کر پاتے۔

بہرصورت سیاسی موضوع پر سوچتے وقت پہلا سوال یہ آنا چاہئے کہ سیاسی اعتبار سے وہ کیا مقصد ہے جسے ہمیں حاصل کرنا ہے اور وہ کونسی منزل ہے جس تک ملت اسلامیہ کو پہنچنا ہے۔اس سوال کا جواب شریعت کی روشنی میں سامنے آنا چاہئے۔مگر اس رخ پر سوچا نہیں گیا۔چنانچہ اس سوال کا جواب ہماری موجودہ سیاسی سرگرمیوں کو دیکھنے سے یہ ملتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح وہ حقوق حاصل کرسکیں جو انہیں دستور ہند نے دیئے ہیں۔گویا مسلمانوں کی ساری سیاسی سرگرمیوں کا محور حقوق طلبی اور دستور ہند کے چوکھٹے میں رہ کر ترقیوں کی منزلیں طے کرنا ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے چار فارمولوں کو گزشتہ پچاس سالوں میں اپنایا گیا ہے۔اگرچہ کہ تقسیم کے فوراً بعد مولانا آزاد نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس کرکے طے کردیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانا نہ صحیح ہے اور نہ مفید۔اس کے باوجود کئی گوشوں سے مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم بنائی گئی ہے۔اگرچہ کہ یہ راہ اپنانے والے بھی فرقہ پرستی کے الزام سے بچنے اور اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے برائے نام اپنا دروازہ غیرمسلموں کے لئے کھولنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

اس زمرے میں مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد، مجلس بچاؤ تحریک حیدرآباد، مسلم مجلس لکھنؤ اور مسلم لیگ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔دوسرا فارمولہ جو بنایا گیا وہ یہ تھا کہ مسلمان انفرادی طور پر جس سیاسی پارٹی میں چاہیں شریک ہوں اور مسلم مفاد کے لئے کام کریں۔چنانچہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو ہم تین زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔پہلے مذہب بیزار مثلاً کمیونسٹ پارٹی، دوسرے نام نہاد سیکولر پارٹیاں جو ایک سے زائد تعداد میں موجود ہیں۔تیسرے ہندو احیاء پرست پارٹی مثلاً بھاجپا۔آپ دیکھئے کہ ان تینوں قسم کی پارٹیوں میں مسلمان کسی نہ کسی مقدار میں اور کسی نہ کسی کیفیت کے ساتھ شریک ہیں اور ان کی بھرپور معاونت کرتے ہیں۔اس طرح مجموعی لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت بہرصورت سیاسی عمل سے وابستہ رہی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک کی دوسری اکائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی چیخ پکار الیکشن کے موقع پر زیادہ سنائی دیتی ہے۔اس کا اندازہ مسلم علاقوں میں جلسے جلوسوں اور ووٹنگ کے وقت برقعہ پوش خواتین کی قطاروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ایک چوتھا فارمولہ جس

کا چرچا عموماً کیا جاتا ہے اور بعض حلقوں نے عملی طور پر بھی اپنانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان دوسرے اقلیتی اور پس ماندہ طبقوں سے مل کر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔

ان چار فارمولوں کے علاوہ کوئی نیا فارمولہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس لئے گھوم پھر کر انہیں چار فارمولوں میں سے کسی ایک کو مختلف لوگ اپنا رہے ہیں۔ اس کی واضح مثال وہ فیصلہ ہے جو ملک کی پانچ مذہبی جماعتوں نے کیا ہے اور ایک مسلم ایجنڈہ مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے اس مسلم ایجنڈہ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

مشاورتی گروپ کے کنوینر مسٹر سیف الدین سوز نے کہا ہے کہ ''مسلم ایجنڈا تفصیلی صلاح ومشورے کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایجنڈا ملک کے اس دوسرے سب سے بڑے مذہبی گروپ کی جائز امنگوں کی نمائندگی کرتا ہے جس نے ہمیشہ سیکولر نظام میں یقین رکھا ہے۔ لیکن جس کی سیاسی مایوسی کو سیکولر مخالف طاقتیں غلط طور پر استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مسٹر سوز کے مطابق اس سیاسی مایوسی کی زیادہ تر وجہ مقننہ اور اقتدار کے ڈھانچے، سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں کم نمائندگی ہے۔ مسلم اقلیت کو حکومت اور ایڈمنسٹریشن میں ناکافی نمائندگی دی جا رہی ہے اور ترقیاتی اور فلاحی فنڈز کی تقسیم میں اس کے ساتھ امتیاز کیا جا رہا ہے۔ مسٹر سیف الدین سوز نے مزید کہا کہ سیکولر طاقتوں میں افراتفری سے بھی مسلمانوں میں احساس مایوسی پیدا ہوا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سیکولر پارٹیوں کے درمیان مکمل مفاہمت پیدا ہوتا کہ فرقہ واریت کے سیلاب اور فرقہ پرست پارٹیوں کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسلم ایجنڈے کے اجراء کے بعد مسلم تنظیموں کے سربراہ یا نمائندے سیکولر سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں سے جلد از جلد ملاقاتیں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان سیکولر سیاسی پارٹیوں سے مسلم ایجنڈے پر ہمدردانہ غور کرنے اور اس ایجنڈے کو ان کے انتخابی منشور میں شامل کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ مسلم تنظیمیں ان سیاسی پارٹیوں پر اس بات کے لئے بھی زور دیں گی کہ وہ متحد ہو جائیں اور ردوبدل یا مفاہمت کے ذریعہ انتخابات میں فرقہ پرست پارٹیوں سے سیدھا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سیاسی پارٹیوں سے یہ درخواست بھی کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو سکے تقریباً ایک سو سے زیادہ مسلم آبادی والے پارلیمانی حلقوں میں صرف ایک مشترکہ مسلم امیدوار نامزد کریں۔''

ایک پریس نوٹ کے مطابق اس مسلم ایجنڈے میں اقلیتی تعلیم کی ایک کل ہند کونسل تشکیل دینے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے جس کو قانونی درجہ حاصل ہوگا۔ تمام سرکاری ملازمتوں کی تمام سطحوں پر مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، اردو اور دوسری تمام اقلیتی زبانوں کو ان ریاستوں میں جہاں ان کی آبادی دس فیصد ہے۔ دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا، مسلم پرسنل لاء میں عدم مداخلت کی یقین دہانی کرانا، بابری مسجد کے مقام کو مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لئے مسلمانوں کے حوالے کرنا، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی عبادت گاہوں کی حیثیت برقرار رکھنے

کے قانون مجریہ ۱۹۹۱ء پر فوری عمل، مسلم ایجنڈے میں شامل دوسرے نکات ہیں۔ اس ایجنڈے کے دیگر اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

- مسلم فرقہ کو شدت پسند قوم پرست عناصر کے دباؤ اور اس کو بدنام کرنے کیلئے شروع کی گئی مہم سے مسلم فرقہ کے وقار کے تحفظ کے لئے موثر اقدامات۔
- تمام وقف املاک کو کرایہ کنٹرول قانون، شہری جائیداد کی حد بندی اور زرعی اصلاحات سے متعلق قوانین سے مستثنیٰ کیا جائے۔
- جن وقف املاک کا حلیہ اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کی بحالی ممکن نہیں ہے، ان کا معاوضہ موجودہ بازار بھاؤ کے مطابق ادا کیا جائے۔
- از کار رفتہ حج کمیٹی قانون مجریہ ۱۹۵۱ء کی جگہ ایک نیا قانون بنایا جائے۔
- سہ لسانی فارمولہ کے تحت اردو کو پہلی زبان کے طور پر اختیار کرنے اور پرائمری اسکول کی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں امتیاز کو ختم کیا جائے۔
- آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے ان تمام مرکزوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی آبادی ہے ان کے تناسب سے اردو پروگراموں کے لئے وقت دیا جائے۔
- آسام میں ناجائز تارکین وطن کا سراغ لگانے کے لئے بنائے گئے قانون آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ مجریہ ۱۹۸۳ء کو برقرار رکھا جائے۔''

(پانچ مسلم تنظیموں کا ایجنڈا ایک پریس کانفرنس میں جاری کیا گیا جس میں ان تمام تنظیموں کے نمائندے موجود تھے) سہ روزہ دعوت دہلی ۱۳/ جولائی ۱۹۹۹ء۔

اس مسلم ایجنڈا میں کیا دم خم ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم چار اخباری تبصرے یہاں پیش کرتے ہیں۔ سہ روزہ دعوت دہلی کے مدیر ۱۹/ جولائی ۱۹۹۹ء کے اداریہ میں رقمطراز ہیں:

''کوئی شک نہیں کہ مسلم ایجنڈا مسلمانانِ ہند کی امنگوں اور ان کے احساسات کا ترجمان ہے اس میں شامل کئے گئے امور و مسائل حل طلب ہیں۔ پانچ تنظیموں نے انہیں اٹھا کر ایک دیرینہ ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ لیکن اس موقع پر نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ بعض بنیادی حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ان حقائق سے چشم پوشی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ کسی بھی قسم کی خوش فہمی یا سادہ لوحی مسائل پیدا کرسکتی ہے۔ ایک تو یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ ملک کے ارباب سیاست مسلمانوں کے ان مسائل سے واقف نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ارباب سیاست اتنے دیانتدار اور انصاف پسند واقع نہیں ہوئے ہیں کہ جیسے

ہی ان کے سامنے مسلمانوں کی یہ ضروریات پیش کی جائیں گی وہ بغیر کسی مصلحت کے ان کی تکمیل میں لگ جائیں گے۔ تیسرے یہ دیکھنا ہوگا کہ جن پارٹیوں کو سیکولر سمجھا جاتا ہے ان کے لیڈر فی الواقع کتنے سیکولر ہیں اور اپنی بات پر قائم رہنے کی کتنی جرأت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولرزم ان پارٹیوں کا عقیدہ نہیں کہ اس کی خاطر وہ ہر صورت حال کا سامنا کریں گی خواہ اس میں انہیں سیاسی لحاظ سے گھاٹا ہی ہو رہا ہو۔ سیکولرزم دراصل ان پارٹیوں کی حکمت عملی یا سیاسی ضرورت ہے اور مسلمانوں سے ان کی دلچسپی صرف ان کے ووٹوں تک محدود ہے۔ چوتھی اہم بات یہ ہے کہ قانون ساز اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا سوال اس انداز میں اٹھانے سے فرقہ پرست اور فسطائی حلقوں کو تقویت مل سکتی ہے وہ مسلمانوں کے خلاف شور مچا کر نام نہاد ہندو اکثریت کو ورغلانا شروع کردیں گے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ہوگا کہ ریزرویشن جیسے حساس مسئلے پر وہ مسلم مخالف ماحول پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ نچلے اور پسماندہ طبقات پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کا کوئی منفی ردعمل تو نہیں ہوگا۔ ریزرویشن کے سلسلہ میں، بالخصوص سرکاری ملازمتوں کے تعلق سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے ہاتھ تو کچھ نہ آئے الٹا ان کے مخالف سیاسی طور پر مضبوط ہو جائیں۔ امید ہے مسلم مشاورتی گروپ کے ذمہ داران اپنی مہم آگے بڑھانے سے قبل ان حقائق کا جائزہ اچھی طرح لیں گے۔''

ہفت روزہ ''اخبار نو'' دہلی نے ۲۱ر تا ۲۷ر جولائی ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے:

''عام انتخابات کے موقع پر ملک کی پانچ بڑی مسلم جماعتوں کے درمیان اتحاد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جہاں تک ۳۴ نکاتی ایجنڈا کا معاملہ ہے تو وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبودگی سے وابستہ ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ملک میں جس طرح غیر یقینی سیاسی صورتحال ہے اور صرف مفاد پرستی کی سیاست کی جارہی ہے کیا سیکولر جماعتیں فرقہ پرستی کے خلاف یا اس نام پر متحد ہوسکتی ہیں جب بھی ملک میں انتخابات کا وقت آتا ہے تو سیکولر ووٹوں کی تقسیم روکنے اور فرقہ پرست طاقتوں کو ہرانے کی اپیل کی جاتی ہے لیکن سیکولرزم کا نقاب لگائے جماعتیں آج بھاجپا کی انگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ سمتا پارٹی، ترنمول کانگریس، لوک شکتی جیسی پارٹی کے قائد سیکولرزم کا راگ الاپ رہے ہیں اور بھاجپا کی قیادت والے محاذ میں بھی شامل ہیں۔ جہاں تک غیر بھاجپا جماعتوں کا تعلق ہے تو کانگریس اور سماج وادی کے درمیان اتحاد اب ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ اسی طرح بہوجن سماج پارٹی اور کانگریس کے درمیان اتحاد ممکن ہے۔ لیکن سماج وادی کے ساتھ اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک علاقائی جماعتوں کا تعلق ہے تو بیشتر جماعتیں بھاجپا قیادت والے محاذ میں شامل ہیں۔ ملک میں اب سیکولرزم کی بقاء کے لئے فرقہ پرست بھاجپا کو ہرانے کا نعرہ دم توڑ رہا ہے کیوں کہ نام نہاد سیکولر جماعتیں صرف اپنے مفاد اور بقاء کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں جب کہ سیکولر جماعتیں

انتشار کا شکار ہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اس وقت اختلافات میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ جب مرکز میں بھاجپا سرکار اقلیت میں آ گئی اور سیکولر جماعتیں متبادل حکومت کی جگہ ملک میں انتخابات کرانے میں دلچسپی لینے لگیں تو ایسے حالات میں ملک کی سب سے بڑی اقلیتوں کی نمائندہ تنظیموں کی سیکولر جماعتوں سے اپیل کتنی کامیاب ثابت ہوگی یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک اس اتحاد کا تعلق ہے وہ قابل ستائش ہے۔ مگر صرف ایجنڈا بنا کر سیاسی جماعتوں کے ساتھ بات کرنے سے کیا ہوگا؟ اگر مسلمان الیکشن میں اس ایجنڈا کے تعلق سے کوئی رخ اپنائیں تو سیاسی جماعتوں پر انہیں یہ یقین کیسے آئے گا کہ وہ اس ایجنڈا پر واقعی عمل کریں گے؟ دوسرے سیاسی جماعتوں میں سے اگر کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار ہوتی ہے تو پھر ان پانچوں تنظیموں کے رہنماؤں سے وہ جماعت یا جماعتیں حمایت کی بھی طلبگار رہوں گی اور وہ جماعتیں الیکشن میں ایک دوسرے کے مدمقابل بھی ہو سکتی ہیں۔ اس صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور پانچوں تنظیموں کے ذمہ داروں کو اس پر اور بھی زیادہ گہرائی سے غور کرنا چاہئے۔''

اطہر معین صاحب نے روزنامہ منصف حیدرآباد ۱۱/ اگست ۱۹۹۹ء میں لکھا ہے:

''ملک اس صدی کے آخری ایام میں نازک سیاسی حالات سے دوچار ہے اور آئندہ چند دنوں میں انتخابات کا بھی سامنا ہے۔ ان انتخابی نتائج کے دوررس نتائج حاصل ہونے والے ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کو بڑی دور اندیشی اور سیاسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرنے اور موجودہ سیاسی حالات میں نہایت ہی اہم اور کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ انتخابات سے قبل بعض تنظیموں نے مسلم مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ایک منصوبۂ عمل مرتب کیا ہے جسے سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے اسے قبول کرنے والی سیاسی جماعتوں کی تائید کرنے کا اعلان کیا گیا لیکن ان تنظیموں نے ملک کے مختلف ریاستوں کی سیاسی صورتحال کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے اور نہ ہی مقامی مسائل کو اپنے منصوبۂ عمل میں شامل کیا۔ علاوہ ازیں مسلم تنظیموں کی جانب سے مرتبہ منصوبۂ عمل صرف کانگریس پارٹی کو ہی پیش کیا گیا جسے اس نے قبول بھی کر لیا۔ اس منصوبۂ عمل میں صرف مطالبات پیش کئے گئے لیکن مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی ترقی کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دینے کا مطالبہ کیا گیا لیکن اس خصوص میں کوئی واضح تیقن نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی کہ آئندہ انتخابات میں ہی پارٹی مخصوص تعداد میں مسلم امیدواروں کو ٹکٹ دے۔ ماضی میں بھی یہ دیکھا گیا کہ انتخابات سے قبل سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے منشور مطالبات کو بلا چوں و چرا قبول کر لیتی ہیں چونکہ وہ کسی بھی صورت میں مسلم ووٹ بینک کو کھونا نہیں چاہتیں لیکن جب اقتدار میں آ جاتی ہیں تو اپنے وعدوں اور دعوؤں کو نہ صرف فراموش کر جاتیں بلکہ مسلم دشمن اقدامات سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ہمارے پاس ایسی نظیر بھی موجود ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے قائم کردہ کمیشن کے سربراہ

جب وزارت عظمی کے عہدہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے خود اپنی سفارشات کو روبہ عمل لانے سے احتراز کیا لہٰذا مسلم تنظیموں کو صرف منشور مطالبات پیش کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہئے کہ حکومت تشکیل پانے پر ان کے پیش کردہ پروگرام پر عمل آوری ہوگی بلکہ انہیں اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوگا۔''

ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد صاحب روزنامہ منصف ۱۳؍اگست ۱۹۹۹ء میں لکھتے ہیں:

''اس مرحلہ پر مسلم قیادت کو بھی طے کر لینا چاہئے کہ بازار سیاست میں بے وزن بکنے سے بہتر ہے کہ اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا عزم کر کے اٹھیں۔ اگر مسلم قیادت یہ طے کرتی ہے کہ جو پارٹی اس ''مسلم ایجنڈے'' کو تسلیم کرتی ہے جو ملک کی پانچ سرکردہ مسلم تنظیموں کی جانب سے جاری کیا گیا ہے تو پھر آنے والے انتخابات میں مسلمان ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی ہند، کل ہند مسلم پرسنل لاء بورڈ، ملی کونسل اور مسلم مجلس مشاورت نے جس مسلم ایجنڈے کے خدوخال پر اتفاق رائے کر لیا تھا وہ تو منظور کر لیا گیا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی عمل میں آ گئی۔ لیکن تادم تحریر ان جماعتوں نے ملک کی اہم سیاسی جماعتوں سے نہ کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ ہی مسلم رائے عامہ کو ''مسلم ایجنڈے'' کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیس کروڑ کی ملت اسلامیہ ہند کا یہ قافلہ آنے والے انتخابات کے موقع پر بھی بے قیادت رہے گا اور ہر علاقہ کے مسلمان اپنے طور پر فیصلہ کریں گے جس سے سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ مسلم ایجنڈے میں جن امور کا تذکرہ کیا گیا وہ مسلمانان ہند کو گذشتہ پچاس سال سے درپیش ہیں۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، مسلم پرسنل لاء میں مداخلت یا تبدیلی کے امکان کا خاتمہ، بابری مسجد کی تعمیر نو، شرپسندوں کی شرارتوں اور مسلم مخالف مہم سے مسلمانوں کا تحفظ، اوقاف کی جائیدادوں کا تحفظ، اردو کی ترویج و ترقی اور آسام کے مسلمانوں کو غیر ملکی باشندوں کا ہوا کھڑا کرنے والوں کی ریشہ دوانیوں سے بچانا، یہ مسلم ایجنڈے کے خاص نکات ہیں۔ ملک کی جو بھی پارٹی ان نکات کو روبہ عمل لانے کا وعدہ کرتی ہے مسلمان بہرحال اس کے حق میں سوچ سکتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل بعض ''کالی بھیڑیں'' اس مسلم ایجنڈے کو عام مسلمانوں سے اوجھل رکھ کر کسی ایک پارٹی کے کشکول میں مسلمانوں کے ووٹ ڈلوانا چاہتی ہیں۔ اگر ملک کی کوئی پارٹی اس سازش میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر ایک بار مسلمانوں کو الیکشن کے بعد کف افسوس ملنے کے سواء اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس تاریخ ساز الیکشن میں جس کے دروازے پر ہم پہنچ چکے ہیں ہمیں بہت ہی دوراندیشی اور مومنانہ فراست سے فیصلہ کرنا چاہئے۔ ہمیں کسی پارٹی کے تعلق سے کوئی خوش فہمی یا سادہ لوحی کا شکار ہوئے بغیر حقائق کی بنیاد پر اس کے حسن و قبح کا جائزہ لینا چاہئے اور بغیر کسی مصلحت کے ملت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیونکہ ہمارے قائدین نے پہلے سے طے کر لیا ہے کہ ان کی ہمدردی کس پارٹی کے ساتھ ہے۔

یہ تبصرے بڑے احترام اور ادب کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن دبی زبان میں مسلم ایجنڈا کی بے مائیگی اور سطحیت کو انہوں نے اجاگر کر دیا ہے۔ یہاں سوچنے کا یہ پوائنٹ بھی ہے کہ جن چار فارمولوں کو بار بار پچاس سال تک آزمایا گیا ہے انہیں کو پھر آزمانے کا کیا جواز ہے؟ کیوں نہ ہم تھوڑا توقف کر کے کوئی دوسرا نسخہ تلاش کریں۔

موجودہ پارلیمانی سیاست اور سیاسی نظام کی سب سے بڑی ناانصافی یہ ہے کہ مسلم آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کن موثر حلقہ ہائے انتخابات کو درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور کئی حلقوں کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ مسلم ووٹوں کی اہمیت گھٹ گئی جس کی وجہ سے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمان ارکان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ساتویں لوک سبھا میں مسلم ارکان کی تعداد ۴۶ تھی۔ آٹھویں لوک سبھا میں ۴۱ ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں ۳۳، ۱۹۹۱ء میں ۲۸، ۱۹۹۵ء میں ۲۷ اور بارہویں لوک سبھا میں ۲۸ رہ گئی۔

اس طرح مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن انتہائی کمزور ہوگئی ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن نے حالیہ مردم شماری کی رپورٹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اقلیتیں ملک کی آبادی کے ۱۸.۵۹ فیصد پر مشتمل ہیں۔ اگر ان اقلیتوں میں مسلمانوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ۱۴ کروڑ ہے۔ لیکن ملک کی دولت اور اقتدار میں ۳ فیصد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نوبت تک کس نے پہنچایا ہے۔ اس کے جواب میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا سیکولر لوگوں کا ہے اس لئے کہ ۱۳ ماہ ۱۳ دن کے علاوہ چالیس سال ملک کی زمام کار سیکولر پارٹیوں بالخصوص کانگریس کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود سیکولر پارٹیوں سے آس لگا کر بیٹھنا کہاں کی دانشمندی ہوگی۔''

یہی وہ بات ہے جو الیاس اعظمی صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ نے کہی ہے:

''آج پچاس سال گزرنے کے باوجود مسلم اقلیت سیاسی طور پر لاچار ہی نظر آرہی ہے۔ ملک کی آزادی کے دن تقریباً چار کروڑ کی تعداد والی آج پچاس سال بعد جو اپنے کو پچیس کروڑ کہتی نہیں تھکتی لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تیرہ کروڑ ہونے کے باوجود اپنا سیاسی طور پر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ آج سے پچاس سال قبل جس چوراہے پر کھڑی تھی آج بھی وہیں نظر آرہی ہے۔

میری اس بات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمان کاروباری طور پر کافی مضبوط ہو گیا ہے وہ عرب دنیا سے روپئے کمانے کے بعد اس انداز کا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں مکان خریدتا ہے۔ اپنے ذاتی اخراجات سے ایک بہتر زندگی گزارتا ہے اور اپنی شادی بیاہ کی تقریبات میں اپنے ہم وطنوں کو دوسرے نمبر پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بیشک مسلمانوں نے ترقی کی ہے جس سے کسی کو انکار بھی نہیں ہے لیکن ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جس ترقی کی بات میں کر رہا ہوں اس میں تو ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں چھوٹی سے چھوٹی تعداد رکھنے والی

اقلیت بھی آج اپنا سیاسی وزن محسوس کراتی ہے لیکن ہم تیرہ فیصد کی تعداد رکھنے والے مسلمانوں نے وعدوں کے سہارے ہی پچاس سال گزار دیئے اور پھر بھی ہم مزید وعدوں پر بھروسہ کرنے کو تیار ہیں۔

جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی آزادی کے وقت ہمارے تیس فیصد افراد سرکاری نوکریوں میں تھے جو آج گھٹ کر صرف دو فیصد رہ گئے ہیں۔ آج ہماری آبادی کے تیس فیصد افراد ندی کے پشتوں پر نالوں کے کنارے، سڑکوں کے کنارے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آج ہمارے مسلم محلے گندی بستیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ آج بھی مسلم علاقوں میں اسکولوں، شفاخانوں، مستورات کے لئے کڑھائی بنائی کے تربیتی مراکز کا فقدان ہے۔ تقریباً بیس ہزار فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر احساس جرم پیدا کرنے کی کوشش کا کیا جانا، بابری مسجد میں بزور طاقت مورتیوں کا رکھا جانا، سب انسپکٹر رام دیو دوبے کے ذریعہ لکھائی گئی ایف آئی آر پر عدالت کا کوئی کارروائی نہ کرنا، مسجد کو دفعہ ۱۴۵ کے تحت قرق کرنا اور مسلمانوں کے لئے مسجد سے دوسو میٹر دور رہنے کے احکامات صادر کرنا، مسجد کا تالا کھلوانا، متنازعہ جگہ پر شیلا نیاس کرانا اور پھر فرقہ پرست تنظیم آر ایس ایس اور اس کے سیاسی بازو بھاجپا کی سرپرستی میں ہی اس کی ذیلی جماعتوں کے ذریعہ بابری مسجد کو شہید کرادیا جانا، یہ سب وہ حالات ہیں جو پچاس سال میں مسلمانوں کے حصے میں آئے۔

اس میں تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پچاس برسوں میں مسلمانوں کے سب سے پہلے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ پھر مسلمانوں کی لیڈر اندرا گاندھی ہوئیں، پھر مسلمانوں کے لیڈر بہوگنا ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر چودھری چرن سنگھ ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر راجیو گاندھی ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر نرسمہا راؤ ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر ملائم سنگھ یادو ہوئے، اس کے بعد لیڈر کون ہوگا یہ وقت ہی بتائے گا لیکن یہ سب وہ لیڈران ہیں جنہیں گزشتہ پچاس برسوں میں مسلمانوں نے ووٹ دیا جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

مندرجہ بالا لیڈران وہ ہیں جنہیں سیکولر کہا جاتا تھا اور جن کے ہاتھ میں اقتدار بھی تھا وہ اپنے اقتدار کے ذریعہ مسلم اقلیت کو پریشانیوں سے نجات دلانے کی حالت میں تھے۔ لیکن ان لیڈران نے کسی ایک معاملہ میں بھی فرقہ پرست تنظیموں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ جس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد جتنے بھی تحقیقاتی کمیشن تشکیل پائے ان میں سے کچھ کے علاوہ زیادہ تر کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی اور اگر چند کی رپورٹ منظر عام پر آبھی گئی تو اس رپورٹ کی بنیاد پر جن سرکاری یا غیر سرکاری افراد پر الزامات ثابت ہوئے ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی قانونی کارروائی کر کے سزاء نہ دلائی جاسکی۔ بھیونڈی (مہاراشٹرا) کے فساد کے بعد جسٹس مادان کمیشن تشکیل پایا تھا جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں کہا تھا کہ ایسے لوگ پولیس کی وردی پہنے ہوئے تھے جن پر پولیس کی وردی زیب نہیں دیتی۔ ان لوگوں نے پولیس کی وردی کی بے عزتی کی ہے۔ اس کے باوجود کسی ایک کو بھی سزا نہیں مل پائی۔ اسی طرح مراد آباد میں ۱۹۸۰ء کا فساد ہوا تھا اس کی رپورٹ پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ میرٹھ، ہاشم پورہ اور ملیانہ کے واقعات میں

جب کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہوگیا کہ بدنام زمانہ پی اے سی کے ذریعہ ۴۲ کڑیل نوجوانوں کو گولی سے اڑا دیا گیا کمیشن کے ذریعہ پی اے سی کے جوانوں کو نامزد بھی کر دیا گیا لیکن آج تک وہ آزاد گھوم رہے ہیں۔

اس کے برعکس ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مسز اندرا گاندھی کے قتل کے ردعمل میں سکھ قوم کے خلاف فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں کافی تعداد میں سکھ قوم کے افراد مارے گئے لیکن سکھ قوم نے ایک فساد پر ہی دہلی ہائی کورٹ جا کر انصاف حاصل کر لیا۔ گناہ گاروں کو سزاء دلوائی اور اپنے رشتہ داروں کی موت کا معاوضہ دس، دس لاکھ روپئے منظور کرایا۔ یہ سکھ قوم بھی ہندوستان کی ایک اقلیت ہے جو مسلمانوں کے ۱۳ فیصد کے مقابلے میں صرف ۲ فیصد ہی ہے۔

یہ قومیں ہماری طرح نہیں کہ ہم انتظار کرتے رہے کہ یہ سیکولر پارٹیاں اپنے کئے وعدوں کے مطابق بابری مسجد کی حفاظت کے لئے ایودھیا میں موجود رہیں گی اور فرقہ پرستوں کے سامنے سینہ سپر ہوں گی لیکن ایودھیا میں کسی ایک بھی سیکولر لیڈر کا پتہ نہ تھا اور بابری مسجد آسانی کے ساتھ شہید کر دی گئی اور حکومت وقت کے سربراہ مسٹر نرسمہا راؤ کی خاموش حکمت عملی نے اس کام کو اور بھی آسان بنا دیا۔ کانگریس اور سیکولر پارٹیوں کے لیڈران اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی پر یہ تماشہ دیکھتے رہے اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت خون کے آنسو روتی رہی اور قومی یکجہتی کونسل کی قراردادیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ آج کانگریس نے اپنے سابقہ رویہ پر معافی مانگی ہے تو تمام سیکولر پارٹیوں کو بھی مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہئے کیونکہ یہ پارٹیاں بھی بابری مسجد کے انہدام میں برابر کی شریک ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں ہمارے ووٹ حاصل کرنے کے بعد ہمارے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہیں۔ ہماری کمزوری یہ کہ ہم ۱۳ فیصد ہونے کے باوجود حکومت میں حصہ دار نہیں بن پاتے کیونکہ ان کو اپنی پارٹی کے وہپ کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دے دیا تو ان کی ممبری ختم ہو جائے گی۔

ایسے حالات میں ہماری حالت بالکل ایسی ہوگئی ہے کہ ہم بس میں دھکا لگا کر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد دوسری بس میں دھکا لگانے کے لئے الیکشن کا انتظار کرنے لگتے ہیں یعنی جس بس کو ہم نے دھکا لگا کر اسٹارٹ کر دیا تھا اس کا ڈرائیور ہاتھ نکال کر ہمارا شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بس میں سوار کرنا تو الگ بات ہے۔" (رہنمائے دکن ۲۵/اپریل ۱۹۹۹ء)

مسلمانوں کی لاچاری، بے بسی اور محرومی کی آخر وجہ کیا ہے کہ پچاس سال کے دوران کوئی نسخہ کام نہ آیا اور کوئی دوا بھی ان کے درد کا درماں ثابت نہیں ہوئی جبکہ اسی سرزمین پر دوسری اکائیاں بھی ہیں جو اپنے مسائل کا حل نکال لیتی ہیں اور جن کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جمہوریت کو

کما حقہ پہچانا نہیں بحیثیت مجموعی انہوں نے سادہ لوحی کا ثبوت دیا۔ انہیں جمہوریت کے فریب میں صرف مبتلا ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہلا بہلا کر فریب میں رکھا گیا۔

اس ضمن میں مولانا محمد اسحاق سندیلوی ''استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ'' کے چند الفاظ لائق ملاحظہ ہیں۔

''دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پر فریب اور پر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام ونشان بھی نہیں ہے جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت وامارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب اس کے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے۔ جس میں شخصی آزادی کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب وکمزور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''رواداری کا وعظ کہنے والے ذرا سطحیت کو چھوڑ کر حقیقت پر نظر کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی سب قومیں یہی کر رہی ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کو وضع قانون کا منصب واقعہ کے لحاظ سے کہاں نصیب ہوتا ہے؟ نگاہ حقیقت بیں تو ہر جگہ ''دیو استبداد'' ''جمہوری قبا'' میں پائے کوب'' دیکھ رہی ہے، اور دنیا کو'' آزادی کی نیلم پری'' کا فریب دینا جمہوریت کا بین الاقوامی مزاج بن چکا ہے طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم نام بنام ایک ایک ملک کی جمہوریتوں کی نقاب فریب چاک کر کے ان کی اصلی شکل دکھا دیتے اور یہ مکروہ واقعہ نظر آجاتا کہ ان میں مغلوب قوموں کے نمائندے صرف اس لئے مجالس قانون ساز میں باریاب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کو ذبح کرانے میں آلۂ کار بن سکیں یا کسی غالب پارٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور دنیا کے سامنے حکومت کی رواداری (بے تعصبی) کے گیت گاتے رہیں۔

اگر باطل مذاہب نے اعتقادی شرک کی ترویج کی ہے تو یہ باطل نظریات سیاسی شرک پھیلا رہے ہیں''۔

(''اسلامی سیاست''، مطبوعہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ)

مسلمانوں نے حاکمیت الٰہ کی بنیاد پر سیاست کو چھوڑ کر حاکمیت جمہور والی سیاست کو اپنایا۔ لیکن جمہوریت کو ماننے کا بھی حق ادا نہ کر کے خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کے مصداق بنے ہوئے ہیں آخرت کا انجام روز قیامت معلوم ہوگا دنیا کے خسران کا رونا تو ہر ایک رو رہا ہے۔ دین کے رمز شناس اور دور جدید کے باطل نظریات کے نباض نے کہا تھا کہ جمہوریت میں حقوق ملتے نہیں بلکہ چھینے جاتے ہیں لیکن مسلمانوں نے عام طور سے اسی کو غنیمت سمجھا کہ جمہوریت نے آنسو بہانے اور رونے کا حق دیا ہے۔ اس کے بعد جس نے ہمدردی کا اظہار کیا اور حسین لفظوں میں حسین وعدے کئے اس کو الیکشن میں ووٹ دے دیا اور جب وعدہ کرنے والوں نے وعدہ پورا نہیں کیا تو گلہ اور شکوہ کیا حالانکہ جمہوریت نے جہاں گلہ شکوہ کرنے، رونے دھونے اور مطالبات کی

فہرست پیش کرنے کا حق دیا تھا وہیں اس نے چند جدید ہتھیار بھی دیئے تھے کہ ان کو استعمال کر کے اپنے مطالبات منوا سکتے تھے لیکن مسلمانوں نے ان ہتھیاروں کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کی مثال اس گائے کی ہو گئی جو صرف دودھ دینا جانتی ہے نہ سینگ چلاتی ہے اور نہ لات مارتی ہے۔ مسلمان ووٹ دے کر کامیاب کرتے ہیں لیکن کامیاب ہونے والا اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے تو وعدے یاد دلانے کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

جمہوریت کے جدید ہتھیاروں میں اسٹرائیک، دھرنا دینا، ریلی، پہیہ جام کرنا اور جیل بھرو کے پروگرام ہیں۔ قطع نظر اس میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط جن لوگوں نے اپنی کوئی بات منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ان کی بات کسی نہ کسی درجہ میں مانی گئی اور ان کے مطالبوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ حکومت کسی پارٹی کی ہو جب اس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے تو وہ رک کر سوچتی ہے۔ حکومت کے پاس چاہے کتنی ہی قوت ہو اور وہ خواہ کتنی ہی مضبوط حکومت ہو لیکن پانچ سو لوگ کسی مطالبہ کو منوانے کے لئے سینہ کھول کر کھڑے ہو جائیں تو وہ ہزار پانچ سو لوگوں کو گولی سے بھون نہیں سکتی ہے۔ حکومت کے پاس ہزار ہا ملزموں کو بند کرنے کے لئے جیل ہوتی ہے۔ مگر ایک ہزار افراد کسی ایشو پر گرفتاری دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو حکومت اتنے لوگوں کی رایوں کو اپنے خلاف ہونا آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ سو پچاس نہیں دس بیس آدمی بھی دھرنے پر بیٹھ جاتے ہیں تو حکومت دردسر میں تو ضرور مبتلا ہو جاتی ہے ہزار دو ہزار لوگوں پر مشتمل جلوس اور ریالی نکالی جائے تو حکومت خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑتا ہے اور نیچے سے اوپر تک فکر اور تشویش لاحق ہو جاتی ہے تمام پبلک کا موضوع گفتگو بن جاتا ہے اور اگر جلوس میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی تو اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر اندر اور باہر تبصرے ہوتے ہیں۔ کسی موقع پر پہیہ جام کرنے کا اعلان اگر کسی گروہ نے کیا تو بڑے پیمانے پر حکومتی عملہ کو انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ غرض یہ کہ جن لوگوں سے حکومت کو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری راہ میں مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں ان کی آواز پر کان دھرا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اس راہ کو اپنانے سے پولیس کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں۔ سڑکوں پر گھسیٹے جانے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے قید و بند کا مرحلہ بھی آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن ایسے گروہ کی باتوں کو نظر انداز کرنا کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

اب جائزہ لے کر دیکھئے...... مسلمانوں نے اپنے مطالبوں کو منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو کتنا استعمال کیا ہے اگر جمہوریت کے دیئے ہوئے ہتھیاروں کو استعمال نہیں کیا۔ صرف ووٹ دیتے رہے۔ اپنی ٹوپی، موزے، دستانے اور شیروانیوں کو گرد و غبار سے بچانے کی فکر دامن گیر رہی ہے تو جمہوریت کے دیئے ہوئے میدان میں

انہیں فتح کیسے نصیب ہوسکتی تھی؟ صرف قرار دادیں اور ریز رویشن پاس کرنے سے کسی کا کیا بگڑتا ہے اور کوئی کیوں آپ کے لئے زحمت کرے گا؟؟

مختصر یہ کہ مسلمانوں نے ایک غلط اور غیر مفید نسخہ دواساز سے بندھوایا مگر استعمال اس کو بھی پورا نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ان کا مرض کیسے ختم ہوتا اور ان کے دکھ درد کا کیسے مداوا ہوتا۔ حکمراں طبقہ ہمیشہ طاقت کی زبان سمجھتا ہے طاقت خواہ کسی طرح کی ہو۔ اس مقام پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج کیا ہے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج ایسے نسخہ سے ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہو۔ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔ اس امت کے بعد والے لوگ اسی چیز سے درست ہوں گے، جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔ یہ صحیح اور سچی ایمان کی بات ایسے ہمارے دماغوں سے نکل گئی ہے کہ ہمارا بڑے سے بڑا آدمی بھی ملک وملت کے سدھار اور نجات کے موضوع پر بولتا ہے تو یہی بولتا ہے کہ ہمارے سارے امراض کا علاج جمہوریت اور سیکولرزم کی بقاء اور استحکام میں ہے یہ بولنے کی ہمت اور توفیق نہیں ہوتی کہ سارے جہاں کی بیماریوں کے لئے نسخہ شفاء اسلام میں ہے قرآن میں ہے۔

آپ ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچیں گے تو یہ ماننے کے لئے مجبور ہوں گے کہ مسلمان اس وقت جس شکل میں بھی سیاسی عمل کررہے ہیں وہ بحیثیت مسلمان نہیں کررہے ہیں کیونکہ مسلمان ایک صاحب نظریہ اور صاحب عقیدہ ملت ہیں جن کے پاس عقیدۂ توحید پر مبنی ایک دستور، ایک تفصیلی قانون ''فقہ'' اور مکمل نظام ہے وہ معیشت، معاشرت اور سیاست کے باب میں کچھ ایسے بنیادی اصول رکھتے ہیں جو وقت کے مروجہ اصول سیاست، معاشرت اور معیشت سے بالکل جداگانہ ہیں لیکن مسلمان ان اصولوں کو لے کر سیاست میں شریک نہیں ہورہے ہیں اور نہ برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن ان اصولوں کے ساتھ انہیں کچھ دینے کے لئے تیار ہیں بلکہ انہیں گوارا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی جو حیثیت بھی بنتی ہے وہ یہ کہ بھارت کا ایک اقلیتی گروہ ہے جو بھارت کے دستور کے دیئے ہوئے کچھ حقوق اور اختیارات کا مستحق ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت اور مقام کا تعین دستور ہند کرتا ہے نہ کہ قرآن اور سنت۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ماتحت نہیں ہیں وہ دستور ہند کے ماتحت ہیں۔ وہ شریعت کے محکوم نہیں ہیں آئین ہند کے محکوم ہیں یہ حقیقت واقعہ ہے جس کو تسلیم کئے بغیر ہمیں کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن اس کو برضاء ورغبت قبول کرنا اور اسی پر راضی اور قانع ہوکر محض حقوق طلبی کی سیاست پر قناعت کرنا اور اسی کو کافی سمجھنا نہ عقلی لحاظ سے صحیح ہے اور نہ دینی اعتبار سے۔ اس لئے کہ دستور اسلامی کے بجائے کسی دوسرے کے تابع اور محکوم بن کر حقوق طلبی کی سیاست اختیار کرنے کا آخری نتیجہ غیر اسلامی تہذیب

میں ضم ہوجانا ہے۔ اس لئے کہ جس حالت میں پچاس سال گزرے ہیں۔ حقوق طلبی والی سیاست کے ذریعہ آئندہ اس حالت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکتی اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو تبدیلی بھی ہوگی وہ زوال اور انحطاط کی طرف مائل ہوگی۔ جس کا اندازہ ہمیں اقتدار اور دولت میں مسلمانوں کی حصہ داری کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ کبھی پارلیمنٹ میں ۴۶ مسلمان ممبر تھے اور اب ۲۸ رہ گئے ہیں آزادی کے وقت سرکاری نوکریوں میں ۳۰ فیصد مسلمان تھے اب ۲ فیصد باقی ہیں۔ اسی طرح غیرت دینی اور قومی حمیت میں کمی آئی ہے اور اپنی تہذیب زبان اور اپنے تشخص کے تحفظ کے لئے مدافعانہ کوشش اور احساس زیاں کا گراف بھی ڈاؤن ہے فرض کیجئے اسی طرح اسی کیفیت میں سو دو سو سال ملّت پر گزر جائیں تو ہماری حالت کیا ہوگی؟ دل پر ہاتھ رکھ کر غور فرمائیے اور بتائیے کہ اکیسویں صدی کے ختم تک ملت زبوں حالی کے کس مقام تک پہنچے گی؟!

لہٰذا دینی اعتبار سے موجودہ حقیقت واقعہ کو بخوشی قبول کرنا اور موجودہ سیاسی حکمت عملی کو کافی سمجھنا اور اس پر راضی اور خوش رہنا قطعاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ

① کوئی شخص ہو یا کوئی قوم یا گروہ یا کوئی پارٹی مسلمان کسی کا مستقل تابع دار اور محکوم بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس نے اللہ اور رسول کی تابع داری اور محکومیت بلا کسی شرط اور بلا کسی استثناء کے قبول کرلیا ہے۔ اس نے اللہ کو معبود، حاکم، آمر اور ناہی بلا شرکت غیر کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ کر مان لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح اللہ کی عبادت میں کسی غیر کی شرکت مسلمان کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے اسی طرح اطاعت مطلقہ میں بھی اللہ اور اس کے رسول کے سواء کسی کو شریک کرنا ازروئے کلمۂ توحید ناقابل تسلیم ہے اس کے لئے صرف ایک آیت قرآنی بطور دلیل کے کافی ہوگی۔

① يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء:۸۹)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اولی الامر کی اطاعت کے لئے دو شرطیں ہیں اول ان کا مومن ہونا دوسرے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف نہ ہونا۔

① اُمّتِ مسلمہ اپنے منصب اور ذمہ داری کے لحاظ سے رسول اللہ کی جانشین ہے قرآن نے صراحت کے ساتھ واضح کردیا ہے کہ ہر رسول مطاع ہوتا ہے۔ یعنی اس کی اطاعت کی جاتی ہے سب لوگ اس کے تابع ہوتے

ہیں وہ کسی کا تابع اور مطیع نہیں ہوتا ہے۔ اس روشنی میں امت مسلمہ کی حیثیت بھی اس زمین پر مطاع کی ہے وہ کسی کی تابع، مطیع اور ماتحت نہیں ہوسکتی۔

۲ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (النساء:۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس مضمون کی تائید آیت "وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ" سے بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے کو اقلیت اور بے مایہ تصور کرنا پس ماندہ طبقات میں شمار کرنے کیلئے درخواست کرنا اور تحفظات کی بھیک مانگنا کسی طرح امت مسلمہ کیلئے زیبا نہیں۔

(۳) مسلمانوں کو خیر امت اور امت وسط کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے سوالی بن کر نہ آئے۔ بلکہ اللہ کے بندوں کو مادی اور روحانی ہر اعتبار سے دینے والا انہیں بننا ہے اور اونچے مقام پر کھڑے ہوکر ساری دنیا کو بتانا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؟ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ پھر اس کی حیثیت صرف واعظ اور ناصح کی بھی نہیں ہے دنیا میں عدل اور قسط قائم کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔

۳ كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

۴ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا (البقرۃ:۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔

۵ اِتَّبِعُوۡا مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ (الاعراف:۳)

ترجمہ: تم اتباع اس چیز کی کرو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے تمہارے رب کی جانب سے اور اتباع نہ کرو اللہ کے سواء دوسرے اولیاء کی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت حق کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ غلبہ دین کی جدوجہد بھی اس پر فرض ہے اور غلبہ دین کے لئے وہ سب کچھ کرنا جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے۔

⑥ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (الصّف:۹)

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ دین حق کو تمام دینوں پر غالب کردے، چاہے مشرکین ناپسند کریں۔

گویا میدان سیاست میں مسلمانوں کی منزل اور گول کو یہ آیت متعین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول کا مشن دین حق کو تمام دینوں پر غالب کرنا تھا۔ اس لئے مسلمان ملت کا مشن بھی یہی ہونا چاہئے۔ سیاست کے میدان میں جتنے گروپ بھی کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی نظریہ اور نظام کو غالب اور حکمران بنانے کی بات کرتے ہیں اس پس منظر میں مسلمان کا سیاسی مشن عقیدہ توحید پر مبنی نظام اسلامی کو غالب اور حکمران بنانے کی کوشش کرنے کے سواء کیا ہوسکتا ہے۔

آیت نمبر۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ۔ وحی الٰہی کے علاوہ ہر فکر، ہر خیال ہر نظریہ اور ہر عقیدہ خواہ ''کسی شکل میں ہو'' کی اتباع سے منع کیا گیا ہے اس لئے زندگی کے ہر میدان میں جدوجہد کرتے وقت اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ہم وحی کی پیروی کریں۔ لوگوں کے اھواء کی اتباع سے محفوظ رہیں اس حکم کا اطلاق سیاسی میدان میں بھی ہوگا۔

آیت نمبر۳۔۴ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان کو اپنے منصب اور مقام کا خیال ہونا چاہئے زندگی کے کسی میدان میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں نیچے مقام پر کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا دست نگر بننے کا مظاہرہ نہ ہو اور اس کردار کا سیاسی زندگی میں مزید نمایاں ہونا ازبس ضروری ہے۔

آیت نمبر۱۔۲ سے کھلے طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ کسی مرحلہ اور کسی حالت میں مسلمان کا کردار یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر کسی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

ان قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہماری موجودہ سیاسی حکمت عملی اور اس کی بنیادوں کا غلط ہونا کھلے طور پر دیکھا جاسکتا ہے حقوق طلبی کو سیاسی مقصد بنانا اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے جو چار فارمولے آزمائے گئے ہیں وہ بھی غلط ہیں اس لئے کہ ہر فارمولہ میں قرآن کی کسی نہ کسی تعلیم کو نظرانداز کرنا پڑے گا۔ جہاں تک ان فارمولوں کے بے فیض اور ناکام ہونے کا سوال ہے اس کا جواب گذشتہ پچاس سال کے تجربہ نے لکھ دیا ہے اس کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ ان چاروں فارمولوں کو کچھ عرصہ کے لئے ہم چھوڑ دیں اور کوئی نیا فارمولہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مشن غلبۂ دین کو چھوڑ کر حقوق طلبی کی سیاست نے ملک کی اکثریت کو جو ہمارا دشمن بنا دیا ہے ممکن

ہے اس میں کچھ کمی ہو جائے اور فسطائی قوتوں کو غذا ملنی بند ہو جائے۔ یہ ایک عارضی اور ضمنی فائدہ ہو سکتا ہے سیاسی مفادات کی بناء پر جو اختلافات ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان میں بھی کمی واقع ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ ہم انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے وقت کے شرک اور الحاد کی بنیاد پر چلنے والے سسٹم سے الگ رہ کر اپنے مشن کی مہم چلائی۔ بنی اسرائیل جن کے حالات سے ہندوستانی مسلمان ملت کے حالات زیادہ مشابہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعونی سسٹم سے بالکل الگ رہ کر اپنی مہم چلائی۔ اس طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکانہ سسٹم سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی مہم جاری رکھی۔ حتیٰ کہ مشرکین نے اقتدار اور دولت میں بڑا حصہ دینے کی پیشکش کی تو بھی اس کو قبول نہیں کیا اور وقت کے جاری اور حکمراں سسٹم سے باہر رہ کر جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ بڑے سے بڑا سیاسی مقصد حاصل کر لیا۔ ان وجوہ کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ صحیح ہے اور مفید کہ وہ اقتدار و دولت میں حصہ داری اور دوسرے مطالبوں، اسمبلیوں میں نمائندگیوں اور ملازمتوں کے لئے کشمکش ترک کر دیں۔ یہ روش اور طریقہ کار بحیثیت مجموعی ملّتِ اسلامیہ کیلئے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں مضر ہے۔ یہ کوئی منفی کام نہیں ہے بلکہ غلط لائن چھوڑ کر صحیح لائن پر گاڑی کو ڈالنا ہے وہ صحیح لائن یہ ہے کہ......

① بلا کم و کاست پورے دین کی دعوت دی جائے نہ کسی سے مرعوب ہوا جائے اور نہ کسی کا خوف کھایا جائے۔ مذاہب کی جانب سے عبادت میں پیدا کئے ہوئے شرک کے خلاف بھی آواز لگائی جائے اور اطاعت مطلقہ میں جدید نظریات کے شامل کئے ہوئے شرک کی تردید بھی کی جائے اور بتایا جائے کہ جس طرح بتوں کی پوجا انسانیت کیلئے تباہ کن ہے اسی طرح انسان پر انسان کی حکومت بھی تباہی کا موجب ہے۔ خواہ فسطائیت کی شکل میں ہو یا جمہوریت کی صورت میں۔ عبادت اور اطاعت دونوں کے سلسلہ میں توحید کے کھرے کھرے تقاضے پیش کئے جائیں۔ شرک جس صورت میں بھی اور جہاں بھی پایا جائے گا دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں باعث ہلاکت ہوگا۔ یہ بات واشگاف انداز میں رکھی جائے۔

دعوت کے اس مفہوم کے ساتھ جو لوگ بھی اکٹھا ہوں ان کو منظم کیا جائے ان کی تربیت اور تزکیہ کیا جائے اور پھر ایک منظم جتھے کے ساتھ بے لاگ برملا دوٹوک انداز میں راست اسلام کی طرف بلایا جائے یہاں تک کہ ملک میں قومی کشمکش کے بجائے حق و باطل اور توحید اور شرک کی کشمکش شروع ہو جائے۔ اس وقت جب کہ ہندوتوا اور سیکولرزم دو آپشن ہیں اور لوگوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ

کس کو اختیار کیا جائے اور کس کی تائید کی جائے ہماری کوشش ہو کہ دو کے بجائے تین چیزیں سوالیہ نشان کے طور پر ابھر کر منظر عام پر آجائیں کہ ان تینوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے اور کس میں ملک کی اور انسانیت کی نجات اور فلاح ہے۔ ہندوتوا، سیکولرزم یا اسلام؟

(۲) اپنے تحفظ اور حقوق کو ایشو بنانے کے بجائے پوری خلق خدا کی فلاح و بہبود کیلئے مہم چلائی جائے اور ہر موقع پر ان کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے۔ ظلم و ناانصافی جہاں بھی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور نیکی اور اچھائی کی تائید بلا کسی تعصب اور ذات اور برادری کے امتیاز کے بغیر کی جائے۔

(۳) دور جدید کے جدید ہتھیاروں مثلاً اسٹرائیک، مظاہرے، جلسے، جلوس، دھرنا، پہیہ جام کرنا وغیرہ کو ان کی قباحتوں سے بچتے ہوئے منکرات کے مٹانے اور نیکی اور بھلائی کی ترویج میں استعمال کیا جائے جبکہ دوسرے لوگ محض اپنے معاشی مفادات کے لئے یہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔

(۴) ملک کی اکثریت سے اگر کوئی مطالبہ کرنا ہے تو یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیتی گروہ نہیں بلکہ ایک صاحب عقیدہ نظریاتی گروہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور ایسی عدالتیں ہمارے لئے قائم کی جائیں جن میں مسلمانوں کے آپسی سارے مسائل اور مقدمات کا فیصلہ شریعت اسلامی کی روشنی میں کیا جائے اور ان کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت قبول کرے۔ اوقاف کا پورا نظم و انصرام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو عصری اور دینی دونوں تعلیم کا نظم بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ مختصر یہ کہ اس طرح کا پورا سسٹم چلانے کیلئے ایک باڈی بنائی جائے جس کے ممبران اور ذمہ داران مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب ہوں اور یہ انتخاب بھی الیکشن کمیشن کے ذریعہ کرایا جائے اور مسلمانوں کے ان منتخب نمائندوں کی حیثیت ایم۔ پی کے برابر ہو۔ ملک کی اکثریت کو یہ سمجھایا جائے کہ اس میں نہ ملک کا نقصان ہے نہ ملک کے کسی طبقہ کا نقصان ہے۔ اور فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان ملت کے اندر زیادہ سے زیادہ اطمینان و سکون پیدا ہوگا اور وہ اس طرح ملک کے لئے زیادہ مفید ہوسکیں گے۔

ازالۂ شبہات

اس مقام پر چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

(۱) موجودہ سیاسی حکمت عملی کو ترک کرنے کی جو بات ہم نے کہی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم الیکشن کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ الیکشن میں شریک ہوا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض وقت ضروری ہوگا۔ بشرطیکہ

کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اس وقت کے الیکشن میں قباحت یہ ہے کہ یہاں کئی ایک باطل اور فاسد نظریات وعقائد کی جنگ ہے۔ الیکشن میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک باطل نظریہ کے مقابلہ میں دوسرے باطل نظریہ کی ہم تائید کرتے ہیں۔ ایک فاسد اور مشرکانہ نظام کی جگہ دوسرے فاسد اور مشرکانہ نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہم شریک ہورہے ہیں۔ غور فرمائیے اگر دو بت رکھے ہوئے ہوں اور دونوں کے پروہت دعوی کریں کہ ہمارا بت قابل پرستش ہے اور ہر ایک عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرے اور آخری فیصلہ کیلئے ووٹنگ ہو تو کیا اس ووٹنگ میں کسی مسلمان کا شریک ہونا جائز ہوسکتا ہے؟ ہاں اگر ایک طرف باطل نظریہ اور فاسد نظام ہو اور دوسری طرف عقیدۂ توحید اور نظام حق ہو تو اس وقت ووٹنگ میں شرکت ایک مسلمان کا فرض ہوگا اور وہ نظام حق کے حق میں ووٹ ڈالے لیکن ایک ناحق کی جگہ دوسرے ناحق کو ثابت اور قائم کرنے کیلئے کوئی مسلمان کیسے کھڑا ہوسکتا ہے؟!

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء:٧٦)

ترجمہ: ایمان لانے والے اللہ کے راستہ میں لڑتے ہیں اور کفر کرنے والے طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

(٢) لوگ کہیں گے کہ اس طرح تو ہم ملک میں یکا و تنہا ہو کر ہر اعتبار سے پیچھے ہوجائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے اپنے آپ کو پچھلی لائن میں کھڑا ہی کرلیا ہے سوچئے موجودہ جمہوری سسٹم میں کیا آپ کبھی اکثریت میں آسکتے ہیں؟ الا یہ کہ اللہ تعالی اپنی قدرت سے کوئی راستہ نکال دے۔ اگر آپ اکثریت میں نہیں آسکتے تو آپ آگے کیسے آئیں گے۔ آپ کا دس فیصد آنا بھی اس وقت محال نظر آتا ہے تو آپ کی بات کیسے چلے گی۔ آپ کا وزن کیسے محسوس کیا جائے گا۔ آپ آگے کیسے آئیں گے؟ اِلاّ یہ کہ سیاست میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کی جائے۔ ہم کہتے ہیں آگے آنا ہے تو اس سسٹم کو ہٹانے کی کوشش کیجئے۔ ورنہ پس ماندگی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتے ہیں۔

(٣) کہا جاتا ہے کہ ووٹ ایک امانت ہے اور ووٹ دینا ہمارا قانونی حق ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر یہ بھی تو سوچئے اس امانت کا اہل کون ہے یہ امانت اہل کفر کے حوالہ کی جاسکتی ہے؟ یا ایسے لوگوں کے حوالہ کی جاسکتی ہے جو اپنے دعوئ ایمان کے باوجود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سند کے بغیر قانون سازی کرتے ہیں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو اجتماعی اور سیاسی امور میں پیش نظر رکھنے کے قائل نہیں ہیں اور جو لوگ منصب اور عہدہ کی طلب رکھتے ہیں اور اس کے لئے دن رات دوڑ

دھوپ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ امانت کیسے سونپی جاسکتی ہے؟ کیا کسی ایسے شخص کو مسجد میں امام بنایا جاسکتا ہے جو امامت کی طلب رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرتا ہو؟ ان پہلوؤں سے آپ سوچیں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ موجودہ سیاسی سسٹم ہماری دنیا اور آخرت دونوں کے لئے سم قاتل ہے۔ لہٰذا ہمیں شریعت اسلامی کی روشنی میں کوئی دوسرا راستہ نکالنا پڑے گا۔

(۴) ممکن ہے ان باتوں کو پڑھ کر کچھ لوگ یہ کہیں کہ یہ کیا عجیب بحث کی جارہی ہے۔ اس لئے اس ضمن میں اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے حالیہ ایک قصہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ماہ اگست ۹۹ء کے دوسرے دہے میں اتفاقاً حیدرآباد میں ایک بحث چھڑ گئی۔

مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی صاحب نے کسی موقع پر کہہ دیا کہ فلاں پارٹی کو ووٹ دینا حرام ہے۔ اس اعتبار سے مولانا نے صحیح لائن اختیار کی کہ شرعی اصطلاح استعمال فرمائی۔ کسی چیز کی شرعی حیثیت متعین کرنے کیلئے یہی طریقہ مناسب ہے۔ اس کے جواب میں کہا جانا چاہئے تھا کہ فلاں فلاں وجہ سے حرام نہیں۔ مباح یا مستحب ہے وغیرہ۔ لیکن بے لائن کی بات کہی جانے لگی۔ مثلاً کل ہند سنی علماء بورڈ نے کہا ''ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے......لوگ مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور اپنی پارٹی کو ووٹ دینے کا قانونی جواز رکھتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جمہوری ملک میں شرعی بنیادوں پر بات نہیں کہی جاسکتی۔ کیا اس کے لئے کوئی شرعی دلیل ہے؟

قانونی جواز سے کیا مطلب ہے؟ کیا شرعی جواز کے مقابلہ میں قانونی جواز کی بات کہی جاسکتی ہے؟ جس قانون کی بات آپ کہہ رہے ہیں اس قانون کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ پھر کہا گیا کہ مولانا عاقل صاحب کو فتوی دینے کا حق نہیں ہے۔ فی الحال یہاں نہ تو ہم اصل مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا عاقل صاحب کی بات صحیح ہے یا غلط۔ اگر ضرورت پڑے گی تو ان دونوں پہلوؤں پر کسی وقت گفتگو کی جاسکتی ہے اور گفتگو ہونی چاہئے۔ مولانا عاقل صاحب سے پوچھنا چاہئے تھا کہ حرام کہنے کی علت کیا ہے؟ پھر اس کے بعد بحث کی جاتی کہ ان کی بتائی ہوئی علت صحیح ہے یا غلط ہے اور اس علت کی بنیاد پر کوئی حکم لگانا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

افسوس ہے کہ وضو اور غسل وغیرہ چند مسائل میں علماء فقہی طرز پر بحث اختیار کرتے ہیں۔ بقیہ اجتماعی مسائل میں عام لوگوں کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ جواب طلب سوال صرف ایک ہے وہ یہ کہ کسی قانون ساز ادارہ میں کتاب و سنت، قیاس اور اجماع کو نظر انداز کر کے قانون سازی کیلئے کسی شخص کو شرعاً متعین کیا جاسکتا ہے؟ اس جواب کے بعد معلوم ہوگا کہ کس کو ووٹ دینا حرام اور کس کو حلال ہے۔